ڈاکٹر اسما امانت
استاد، گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ اسلامیہ کالج برائے خواتین، لاہور کینٹ، لاہور

سر سیّد احمد خان کے قومی افکار

Dr. Asma Amanat
Assistant Professor, Govt. Postgraduate Islamia College for Women, Lahore Cantt, Lahore.

National Thoughts of Sir Syed Ahmed Khan

Sir Sayed Ahmad Khan is considered the founder of the two nation's theory and the pioneering leader of the Pakistan movement because of his cultural, political and religious services. The nationalistic services credited to him in the perspective of Pakistanism need to be revisited with reference to his own writings. When Sir Syed's theory of nation is reevaluated through different aspects, it becomes self-evident that he never considered the Indian Muslims a separate nation. He had a secular mind and was out to better the economic conditions of the Indians in general and the local gentry in particular in order to get them into management services so that a bureaucrat class and respectful masses should be made available for the help of the British Government. These were the very objectives of his educational, cultural, political and religious reforms.

Key Words: *Sir Syed Ahmed Khan, National Thoughts, One Nation, Secular.*

سر سیّد احمد خان (۱۸۹۸ء۔۱۸۱۷ء) اردو ادب کے اولین معماروں میں ایک منفرد اور ممتاز شخصیت کے حامل تھے۔ ان کی ذات کے تحقیقی، تدوینی، سیاسی، ادبی اور مذہبی امکانات اتنے وسیع اور متنوع ہیں کہ آج دو صدیاں گزرنے کے باوجود بھی افکارِ سر سیّد پر تحقیق و تنقید جاری ہے۔ سر سیّد کے افکار میں ابہام و ذو معنویت آغاز سے انجام تک رہی۔ اس وجہ سے بھی سر سیّد آج تک ایک متنازعہ حوالہ ہیں۔ بعض ناقدین نے انھیں حب الوطن، دو قومی نظریے کا خالق و داعی ثابت کیا ہے اور بعض انھیں کرسٹان، نیچری اور انگریز وفادار ثابت کرتے نظر آتے ہیں۔ اولالذکر میں تو بہت سے ناقدین کا شمار کیا جا سکتا ہے مگر موخر الذکر میں اکبر الہ آبادی، سر سیّد کے عہد کے مولوی، سلیم احمد، ڈاکٹر شان محمد، ضیا الدین لاہوری، افتخار عالم اور ڈاکٹر مبارک علی کے اسما شامل ہیں۔ سر سیّد احمد خان ایک قومی مفکر کے طور پر جانے جاتے ہیں۔ ان کی تحریروں میں مسلمانانِ ہند کے متعلق ان کے نظریات، ان کا تصورِ قومیت، تصورِ تعلیم، سیاسی شعور اور مذہبی اصلاحات ملتی ہیں۔ ان کے خطبات، مقالات اور مکاتیب کی روشنی

میں ان کے تصورِ قومیت کا جائزہ لیا جائے تو یہ بات ثابت ہو جاتی ہے کہ ان کے قومی افکار مسلمانوں کے مسلم تصور ملّت سے متصادم رہے۔

سر سیّد کے افکار سے پہلے مسلمانوں کے تصورِ قوم و ملّت کو واضح کرنا ضروری ہے۔ عمومی خیال ہے کہ افراد کا ایسا گروہ جس کے عقاید، نظریات، رنگ، نسل، زبان یا آدرش ایک ہوں اور جو کسی ایک نظریہ حیات یا کسی ایک نظام حکومت کے ماتحت ہوں، قوم کہلاتا ہے۔ گویا افراد کے ایسے مجموعے کو قوم کہہ سکتے ہیں جو ایک مخصوص خطے میں رہتے ہوئے کسی ایک نظریہ حیات کے مطابق زندگی بسر کر رہا ہو اور یہ نظریہ زیست اس کے افراد کی زندگی کے تمام پہلوؤں اور تمام امکانات کی تشفی کرتا ہو۔ فیض احمد فیض کے خیال میں ”اگر کوئی گروہ جس کے مفادات آپس میں مشترک ہوں اور جس کی روایتیں، عقاید اور جذبات آپس میں منسلک ہوں جو اکائی کے طریقے سے اپنی زندگی بسر کرنا چاہے اسے قوم کہتے ہیں۔“(۱) چناں چہ وہ عناصر جو قومیت کی تشکیل میں ایک لازمے کی حیثیت رکھتے ہیں ان میں مذہب، جغرافیہ، سماج، سیاست، زبان، رسوم و رواج، روایات اور تاریخ شمار کیے جاسکتے ہیں۔

اسلام نے ایک مختلف نظریہ قومیت کی بنیاد رکھی۔ جس کے تحت عقیدہ اساس ٹھہرتا ہے۔ اسلام نے ایسا مثالی نظریہ قومیت دیا جو رنگ، نسل، زبان اور خطے وغیرہ سے بالاتر تھا۔ اسلام نے صرف تقوی کی بنیاد پر گورے اور کالے، آقا اور غلام اور عربی اور عجمی کو برابری کا درجہ دے دیا۔ اس لیے اسلام نے قوم کے بجائے ملّت کا لفظ استعمال کیا۔ "قرآن حکیم میں جہاں جہاں اتباع و شرکت کی دعوت ہے وہاں صرف لفظ ملّت یا امت کا وارد ہوتا ہے۔ کسی خاص قوم کے اتباع یا اس میں شرکت کی دعوت نہیں۔۔۔۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ خدا نے قرآن میں ایسے افراد کو جو اقوام و ملل سے نکل کر ملّتِ ابراہیمی میں داخل ہو گئے ان کو لفظ قوم سے تعبیر نہیں کیا بل کہ امت کے لفظ سے "(۲) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم فکرِ اقبال کے تناظر میں اقبال کے ان دونوں تصورات کا تقابل کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

”ایک تو یہ کہ ملّتِ اسلامیہ کا کوئی ایک وطن نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ جغرافیائی اور نسلی اور لسانی وطنیت اور قوم پرستی کے انداز جو اس نے مغرب میں دیکھے تو اس کے تاریک پہلو اس کو نہایت بھیانک نظر آئے۔"(۳)

سر سیّد احمد خان کو ”زیادہ مایوس اور تکلیف دہ حالات سے سابقہ پڑا“(۴) کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کے ابتر حالات واضح طور پر محسوس کیے جاسکتے تھے۔ اس حوالے سے کم و بیش تمام مورخین و ناقدین یک زبان ہیں کہ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں کی سماجی، معاشی، اقتصادی حالت دگرگوں تھی۔ ایک تو مسلمانوں پر ۱۸۵۷ء کی جنگ کا تمام تر الزام تھا دوسرا انگریزوں نے اقتدار چوں کہ مسلمانوں سے چھینا تھا اس لیے بھی انھیں مسلمانوں سے خاص عداوت رہی۔

ایسے میں سر سیّد ہی تھے جنھوں نے "ڈوبے ہوئے تاروں کا ماتم" کرنے کے بجائے فکرِ فردا کی راہ دکھائی۔ یہیں سے سر سیّد کے حوالے سے ایک قومی و ملیّ رجحان اپنی نمود کرتا نظر آتا ہے۔ اس رجحان کے تعلیمی، مذہبی اور سیاسی پہلو خاص طور سے سر سیّد کے پیشِ نظر رہے۔ سر سیّد ان ہی تین حوالوں سے ہدفِ تنقید بھی رہے۔ حقیقت پسندی سے دیکھا جائے تو سر سیّد پر تنقید کا محرک ان کی مذہبی تاویلات تھیں اور اسی کی بنیاد پر کلی حوالے سے سر سیّد کے افکار کی نفی کی گئی اور پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ رویہ افکارِ سر سید کے دیگر پہلوؤں کا بھی احاطہ کرتا گیا۔ ڈاکٹر سیّد عبد اللہ اپنی تصنیف سر سیّد احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی نثر کا فنی جائزہ میں افکارِ سر سیّد کی جہات کو مزید محدود کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "سر سیّد احمد خان کے فکر و عمل کے اصلی میدان دو تھے: مذہب اور سیاست۔ ان کے علاوہ اگر کچھ تھا بھی تو ان کے مذہبی اور سیاسی خیالات کے تابع تھا"(۵)

سر سیّد احمد خان نے اپنے افکار میں فکری حوالے سے تصورِ ملّت کو واضح تو کیا ہے مگر عملی طور پر وہ نظریہ قومیت کے قائل رہے۔ پاکستانیت کے تناظر میں سر سیّد کو قومی رہ نما تصور کرنے والے ناقدین ان کے اس تصور کی وجہ سے بھی مغالطے کا شکار ہوئے ہیں۔ فکری سطح پر وہ مسلمانانِ ہند کو قوم کی آب جو سے نکال کر ملّت کے بحرِ بیکراں میں شامل کرتے نظر آتے ہیں۔ تصورِ ملّت کے حوالے سے وہ لکھتے ہیں:

> "اے دوستو! مگر قوم کا لفظ ایک ایسا لفظ ہے جس کے معنوں پر کسی قدر غور کرنی لازم ہے۔ زمانہ دراز سے جس کی ابتدا تاریخی زمانے سے بھی بالاتر ہے۔ قوموں کا شمار کسی بزرگ کی نسل میں ہونے یا کسی ملک کے باشندہ ہونے سے ہوتا تھا۔ محمد صلعم نے۔۔۔ اس تفرقہ قومی کو جو صرف دنیاوی اعتبار سے تھا، مٹایا اور ایک روحانی رشتہ قومی قائم کیا جو ایک جبل المتین لا الہ ال اللہ محمد رسول اللہ سے مضبوط ہے۔ تمام قومی سلسلے، تمام قومی رشتے، سب کے سب اس روحانی رشتے کے سامنے نیست و نابود ہو گئے اور ایک نیا روحانی بل کہ خدائی قومی رشتہ قائم ہو گیا۔"(۶)

سر سیّد احمد خان یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ کسی فرد کی ترقی بھی اسی صورت میں ترقی تصور ہو گی جب وہ اپنی قوم سے رشتہ استوار رکھے گا۔ یہاں سر سیّد قومیت کے حوالے سے مذہب کو اہم عنصر قرار دیتے ہیں۔ ان

کے نزدیک مسلمانوں کے لیے ترقی وہی ہے جو اسلام سے وابستہ رہ کر کی جائے۔ گویا اپنے افکار میں وہ فرد قائم ربطِ ملّت سے ہے کی تفسیر بنتے نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> " مگر یاد رکھو کہ قوم کوئی چیز نہیں ہے جب تک کہ وہ قوم قوم نہ رہے۔ ایک ایک شخص جو اسلام کے گروہ میں داخل ہے وہ سب مل کر مسلمانوں کی ایک قوم کہلاتی ہے۔ جب تک وہ اپنے مذہب کے پیرو اور پابند ہیں تبھی تک وہ ایک قوم ہیں۔ یاد رکھو کہ اسلام جس پر تم کو جینا ہے اور جس پر تم کو مرنا ہے اس کو قائم رکھنے ہی سے ہماری قوم قوم ہے۔ اے عزیز بچے! اگر کوئی آسمان کا تارہ ہو جاوے، مگر مسلمان نہ رہے تو ہم کو کیا۔ وہ تو ہماری قوم ہی نہ رہا۔ پس اسلام کو قائم رکھ کو ترقی کرنا قومی بہبود ہے۔ "[۷]

یہاں سر سیّد لفظ قوم سے ملّت مراد لیتے ہیں اور اسی بنا پر نقاد ان کے نظریے کو "وطنی کم اور ملی زیادہ"[۸] قرار دیتے ہیں مگر وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ ان کا یہ وطنی کم ملی زیادہ نظریہ حالات کے تقاضوں اور اس کی مصلحتوں کا شکار رہا۔ عملی طور پر انھوں نے کسی حد تک اس کی مخالفت کی کہ وہ قومیت کے علم بردار تھے۔ اس امر کا تصفیہ مشکل ہے کہ انھیں مسلمانوں کی فلاح عزیز تھی کہ انگریز حکام کی خوشنودی۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ خلیفہ ترکی کی طرف مسلمانانِ ہند کا جھکاؤ سر سیّد کو پسند نہ تھا۔ ترکی کی فتح پر جب مسلمانانِ ہند نے اپنے ملی جذبات کا اظہار کرتے ہوئے خوشیاں منائی تو انگریزوں کے ساتھ ساتھ یہ امر سر سیّد کو بھی ناگوار گزرا۔ انھوں نے خلیفہ ترکی کو اپنی خلافت ترکی تک محدود رکھنے کا مشورہ دیتے ہوئے انھیں یہ حقیقت باور کرائی کہ ہند کی امتِ مسلمہ انگریزی حکومت کے سایہ اقتدار تلے مکمل امن و امان کے ساتھ مستامن ہے۔[۹] دوسری طرف سر سیّد مسلمانوں کو بھی یہ حقیقت باور کراتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند نے ترکی کی فتح پر جو خوشیاں منائی ہیں اس پر اگر انگریز حکومت نے ناگواری ظاہر نہیں کی تو اس کی کمال فیاضی کی عمدہ مثال ہے۔[۱۰]

سر سیّد احمد خان کی فکر کے مطابق ان کی اس قدر فعالیت کا محرک صرف یہی حقیقت تھی کہ مسلمانانِ ہند کی ابتری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ انھوں نے بہت سے مقامات پر یہی کہا ہے کہ "میرا دل اپنی قوم کی حالت پر نہایت جلتا ہے۔ میں ان کو ایسی خراب حالت میں نہیں دیکھ سکتا۔"[۱۱] اس لیے اپنی قوم کو قعرِ مذلت سے نکالنے کا انھیں جو طریقہ سوجھا وہ تعلیمی اور مذہبی اصلاح کا تھا۔ اولذکر کا مقصد مسلمانوں کو تعلیمی حوالے سے انتظام مملکت میں شامل

کرنا اور موخر الذکر کا مقصد مسلمانانِ ہند کا انگریزوں کے حوالے سے مذہبی تعصب کو ختم کرنا تھا۔لہٰذا سر سیّد مسلمانانِ ہند کے لیے ان دونوں محاذوں پر ڈٹ گئے۔ اپنے خطبات میں سر سیّد واضح انداز میں فرماتے ہیں:

"پھر میں نے اپنے دل سے پوچھا کہ قوم کو اس زمانے کی ضرورت کے موافق تعلیم دینا اور یورپ کے علوم کا ان میں جاری کرنا آیا در حقیقت اسلام کے خلاف ہے؟ مجھے جواب ملا کہ نہیں"(۱۲)

اس طرح سر سیّد نے انگریزی تعلیم کی راہ ہموار کرنے کی ٹھانی۔ اس حوالے سے سر سیّد کے اقدامات دیکھیں تو تراجم سے لے کر کالج تک سر سیّد نے جس محنت شاقہ سے انگریزی علوم کے حصول کا مقصد عام کیا وہ قابلِ داد ہے۔ سر سیّد کے پیش کردہ نظامِ تعلیم سے محض زبان کے علم کی بات نہیں کی بل کہ انھوں نے جدید علوم کے حصول کا جذبہ بیدار کرنے کی کوشش کی۔ حقیقت پسندی نے دیکھا جائے تو ایسا اقدام وقت کا تقاضا بھی تھا کہ مسلمانانِ ہند اس سے پیش تر عربی اور فارسی ادب سے استفادہ کر رہے تھے اور جدید علوم اور سائنسز کے حوالے سے یورپ بھی لائقِ استفادہ تھا۔ انگریز حاکم تھے تو ان کے مزاج سے آشنا ہونے کے لیے ان کے علوم اور ان کا ادب بہت مفید ہو سکتا تھا۔ سر سیّد کے خیال میں ہندستانیوں کو علم تاریخ کی اشد ضرورت تھی کہ "اگر مسلمانوں کو دیگر ممالک کے حالات، ان کی قوتوں اور ان کے استعمال کا علم ہوتا تو ۱۸۵۷ء ایسا نہ ہوتا۔"(۱۳) اس لیے سر سیّد نے انگریزی علوم کو انگریزی زبان میں سیکھنے کی ترغیب دی۔ اس حوالے سے سر سیّد لارڈ میکالے کے خاص مشکور ہیں کہ اس نے انگریزی کو ذریعہ تعلیم قرار دے کر مسلمانوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ لارڈ میکالے کی نسبت سر سیّد کے خیالات بھی غور طلب ہیں۔ فرماتے ہیں:

"کوئی گورنر جرنل (جنرل) اور کوئی وائسرائے ہندستان میں ایسا نہیں گزرا جس نے لارڈ میکالی سے زیادہ ہندستان کو بھلائی پہنچائی ہو۔ گو یقیناً اس نے جو کچھ کیا اپنی گورنمنٹ کی خیر خواہی اور بھلائی کے لیے کیا مگر اسی کے ساتھ اصلی خیر خواہی اور بھلائی کی اصلی جان جس نے ہمارے ملک میں بھی ڈال دی۔"(۱۴)

مذکورہ بالا اقتباس میں یقیناً اس نے جو کچھ بھی کیا اپنی گورنمنٹ کی بھلائی اور خیر خواہی کے لیے کیا قابلِ توجہ ہے۔ لارڈ میکالے کے نظامِ تعلیم کے حقیقی اہداف کسی سے مخفی نہیں۔ لارڈ میکالے نظامِ تعلیم کا مقصد مقامی

لوگوں میں ایک ایسا طبقے کی تشکیل کرنا تھا جو اپنے افکار و تصورات میں انگریز ہو۔ سر سیّد کے تصورِ قوم کو پاکستانیت کی کڑی قرار دینے والے اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں۔

سر سیّد کے نظامِ تعلیم کے باب میں ذریعہ تعلیم کے مباحث بھی لائقِ توجہ ہیں۔ سر سیّد نے کہیں بھی اردو کو چھوڑنے کی بات نہیں کی مگر یہ بھی حقیقت ہے کہ ایسا صرف اقوال کی حد تک تھا۔ عمل کے میدان میں ان کے نظریات قدرے مختلف رہے۔ زبانوں کے حوالے سے وہ ایسا فرماتے تو ہیں کہ ”انگریزی کی تحصیل ہمیں حاکموں اور افسروں سے ملاتی ہے جب کہ عربی کا حصول ہمیں خدا اور اس کے رسول سے ملاتا ہے۔(۱۵) انھیں یہ بھی احساس تھا کہ ”اردو گو ہماری مادری زبان ہے مگر اس کو درست کرنا اور اصلاح پر لانا اور اس کو ایک عملی زبان کے درجے پر پہنچانا ہم مسلمانوں کا فرض ہے۔“(۱۶) اس کے باوجود سر سیّد کی توجہ کا مرکز صرف اور صرف انگریزی زبان رہی اور انھوں نے اس زبان کو دیگر زبانوں سے مقدم خیال کیا۔ اردو کے بارے میں سر سیّد کا یہ خیال تھا کہ یہ زبان دیگر زبانوں کے ساتھ نہیں چل سکتی۔ اس لیے انھوں نے برملا اس حقیقت کا اظہار کیا کہ انگریزی کے ساتھ عربی کی تدریس سے طالب علم کوئی بھی زبان نہ سیکھیں گے۔(۱۷) اور یہ بھی کہ اسلامیات اور دینیات کی تعلیم محض ہمارے عقاید کو درست رکھنے کے لیے ہی کافی ہے۔(۱۸) گویا مسلمانوں کے تصورِ ملّت میں مذہب جو سب سے اہم اور کلیدی عنصر ہے وہ سر سیّد کے تصورِ قوم میں آ کر محض ایک بدنی عبادت تک محدود ہو جاتا ہے۔

تعلیم کے باب میں سر سیّد نے جو نظامِ تعلیم متعارف کروایا تھا، اس کے ساتھ قومیت کا احساس منسلک کرنے کی کوشش بھی کی۔ ان کے خیال میں:

> "ایسی تعلیم جس سے کڑمز انگریزی آ جاوے اور اس طرح سے وہ انگریزی بولنے لگیں جیسے ہندستان میں کمپو کے خدمت گار یا سوداگر یا انگلستان کے قلی اور کیپ مین، تو قوم کو کچھ فائدہ نہیں۔"(۱۹)

ان کے یہاں تعلیم سے مراد جدید تعلیم اور مہذب اخلاق ہے۔ یاد رہے سر سیّد کے نزدیک مہذب اخلاق کا معیار یورپی تہذیب و تمدن تھا۔ اس لیے ان کی نظر میں انگریزی تعلیم کا مقصد سرکاری نوکریوں کا حصول تھا۔ یوں سر سیّد نے تعلیم جیسے ارفع عنصر کو مادی ضرورتوں کا تابع بنا کر ”روزی روٹی سے جوڑا“(۲۰) اور پھر اس میں بھی قومیت کا پہلو شامل کرنے کی کوشش کی۔ ان کے نزدیک ایسی تعلیم جس ”کے ساتھ تربیت (مغربی تہذیب) اور قومیت کی فیلنگ نہ ہو، ہم کو قوم اور ایک مہذب قوم نہیں بنا سکتے"(۲۱)

اس حقیقت سے قطع نظر کہ سر سیّد کے اس نظام نے قومیت کے احساس کو ابھارا یا نہیں مگر اس نظام کی قباحتیں ایسی تھیں کہ ملی حوالے سے ان پر قومیت کا اطلاق مشکل تھا۔ سر سیّد کے نظام کی قباحتیں ان کی زندگی میں ہی سامنے آنے لگ گئی تھیں۔ علوم جدیدہ کو اپنانے والوں نے اپنی ثقافت و تمدن کو بہ نظر حقارت دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ وہ مذہب سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ مگر سر سیّد جیسے مدبر نے اس مسئلے کو بھی محض خطبات سے حل کرنا چاہا۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں ان رویوں کی مذمت و مخالفت کی۔ انھوں نے انگریزی تعلیم کے برے نتائج سے اجتناب پر بھی ایک خطبہ دیا اور نوجوان نسل کو اپنی مذہبی عبادات پر کاربند رہنے اور مغرب میں شادیاں کرنے سے روکا۔[۲۲] مگر انھوں نے مغربی تعلیم کے نقائص کا علاج بھی مزید تعلیم سے کرنا چاہا۔ لہٰذا نوجوان نسل کے بھٹکنے کا خوب سامان میسر ہوا۔ ان حوالے سے ڈاکٹر ظفر حسن کا یہ کہنا بجا معلوم ہوتا ہے:

> "سر سیّد کی تلقین پر ہندستان میں مغربی تعلیم کا جو فروغ ہوا اس کے نتیجے میں مغربی تہذیب نے معاشرے میں جگہ پیدا کر لی۔ دینی حلقوں میں نفرت اور بے چینی پھیلی ہے۔ عوام خصوصاً نئی نسل میں بہت سے شکوک و شبہات بھی پیدا ہونے شروع ہو گئے اور سر سید کی تحریک میں بہت سے غیر متعلقہ، غیر ضروری اور غلط عناصر بھی شامل ہو گئے۔ نتیجے میں ایک ایسی نسل پیدا ہوئی تھی جو برائے نام مسلمان ہو۔ جس پر صرف مغربیت کا غلبہ ہو بل کہ جس کا ایمان کم زور اور متزلزل ہوتا چلا جائے۔"[۲۳]

شاید سر سید کا یہ نظامِ تعلیم ایک کارِ لا حاصل تھا۔ جس کا اعتراف خود سر سیّد نے بھی کیا۔ اپنے مقالے میں وہ ان لوگوں پر تبصرہ کرتے ہیں جو انگریزی تعلیم کے لیے ولایت گئے۔ لکھتے ہیں:

> "مسلمانوں میں تعلیم کی ایسی کمی ہے کہ جو ولایت گئے ہیں ان کو بھی ایسی انگریزی لکھنی نہیں آتی کہ ذی لیاقت انگریز ان کی تحریر کو پڑھ کر خوش ہو سکیں۔ شائد کوئی اس کلیہ سے خارج ہو مگر ہمارے نزدیک تو سوائے نواب عماد الملک کے بہ شرط کہ وہ دل لگا کر کچھ لکھیں کوئی خارج نہیں۔ اگر کسی نے مر گر کر صفحہ دو صفحہ عمدہ انگریزی کا لکھ بھی لیا تو کچھ شمار میں نہیں۔"[۲۴]

علاوہ ازیں سر سیّد نے خواتین کی تعلیم کے حوالے سے اس کے بر عکس خیالات کا اظہار کیا۔ خواتین کی تعلیم کے حوالے سے ان کے اس روایتی اندازِ فکر سے لوگوں کو اس بات کا "شبہ ہو گیا تھا کہ وہ عورتوں کی تعلیم کے

بالکل مخالف ہیں"[۲۵] اس حوالے سے ان کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ وہ قطعی انداز میں الفاظ بدل کر یہی بات دوہراتے رہے کہ "باوجود یہ کہ بہت سی باتوں میں میری طرف نئے خیالات منسوب ہوتے ہیں۔ لیکن عورات کی تعلیم کی نسبت میرے وہی خیالات ہیں جو ہم قدیم بزرگوں کے ہیں"[۲۶] یہاں سر سیّد کی روایت پر ستی فہم سے بالاتر ہے کہ وہ کس فکر کے تحت قوم کے آدھے حصے کو جدید خطوط پر استوار کر رہے تھے اور آدھے کو قدیم پر۔ پھر یہ توقع بھی رکھتے تھے ٹکراو نہیں ہو گا۔ نیز سر سیّد کے نظامِ تعلیم میں دیگر ناقدین کو جو خامیاں نظر آئی ہیں وہ بھی مبنی بر حقائق محسوس ہوتی ہیں۔ مولانا ابوالحسن ندوی اس حوالے سے لکھتے ہیں کہ سر سیّد نے اپنے نظامِ تعلیم کو ہندستان کے مسلم معاشرے کا پابند و ماتحت نہیں بنایا جہاں اس کو نافذ کرنا تھا نیز ان کا تمام زور انگریزی زبان و ادب کے حصول اور اعلی تعلیم پر تھا اور عملی علوم (جو ترقی اور کامیابی کا زینہ اور مغربی اقوام کی ترقی اور کامرانی کا راز ہیں) انھوں نے خاطر خواہ توجہ نہیں کی۔ حالاں کہ مغرب سے لینے اور اس میں کمال حاصل کرنے کی اگر کوئی چیز تھی تو یہی تھی۔ بل کہ انھوں نے صنعتی تعلیم کی تحریک و تجویز کی سخت مخالفت کی۔[۲۷]

دیکھا جائے تو یہ اعتراض اتنا بے جا بھی نہیں تھا۔ کیوں کہ سر سیّد خود اس حقیقت کا اعتراف اپنے خطبات و مقالات میں متعدد مقامات پر کر چکے ہیں کہ سرکار کے پاس اتنی نوکریاں نہیں ہیں جس قدر برصغیر کے لوگ انگریزی تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ گویا جس تعلیم کو سر سیّد نے روزی روٹی سے جوڑا تھا وہ اب معاشی ضرورتوں کو پورا کرنے سے قاصر تھی۔ علاوہ ازیں سر سیّد نے کانگرس کے اس مطالبے کی بھی مخالفت کی کہ مقابلے کے امتحان ہندستان میں بھی ہونے چاہئیں۔[۲۸] نیز سر سیّد کا یہ بھی خیال تھا کہ:

> "ہم گورنمنٹ کی اس تجویز کو کہ تمام اعلی عہدے بجز لائق انگریزی دانوں کے کسی کو نہ دیے جائیں نہایت پسند کرتے ہیں اور جہاں تک کہ اس میں سختی ہوتی جائے ملک کا اور قوم کا اور سب کا فائدہ سمجھتے ہیں اور یقین کرتے ہیں کہ ملک کی ترقی کے لیے اس سے بہتر کوئی تدبیر نہیں ہے۔"[۲۹]

یہ اقتباس سر سیّد کے تصورِ قوم کو مزید واضح کر دیتا ہے کہ اگر سر سیّد کے دل میں مسلمانانِ ہند کا اتنا ہی درد تھا تو پھر وہ انگریزوں کے ایسے اقدامات کو یہ جان کو بھی سراہ رہے تھے کہ مسلمانانِ ہند انگریزی زبان میں مناسب لیاقت حاصل نہیں پا رہے۔ ڈاکٹر مبارک علی سر سیّد کے نظامِ تعلیم کے حوالے سے لکھتے ہیں:

"تعلیمی میدان میں بھی سر سیّد کا دائرہ صرف امرا اور روسا اور شرفا، زمین داروں اور جاگیر داروں کے طبقے تک محدود تھا۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ حسبِ سابق یہ طبقہ حکمراں جماعت میں شامل ہو جائے اور اپنی مراعات کو پھر سے حاصل کرے۔"(۳۰)

سر سیّد کا خیال تھا کہ انگریزی تعلیم ایک ایسا اسمِ اعظم ہے جس کو پڑھتے ہی مسلمانوں پر معاشی و اقتصادی دروازے وا ہونے لگیں گے۔ انھیں تمام مسائل کا حل صرف انگریزی تعلیم اور انگریزی تہذیب میں ہی نظر آتا تھا۔ سبطِ حسن اپنی تصنیف نویدِ فکر میں اس حوالے سے ان کے قومی تصور کو مزید محدود کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"ان کا خیال تھا کہ مسلمانوں نے انگریزی زبان سیکھ لی اور مغربی تہذیب اپنالی تو ان کے اقتصادی اور سیاسی مسائل خود بخود حل ہو جائیں گے (مسلمانوں سے ان کی مراد اونچے اور درمیانہ طبقے کے افراد تھے۔"(۳۱)

گویا سر سیّد نے نوکر شاہی طبقہ تخلیق کرنے کے لیے تعلیم کو طبقاتی بنیادوں پر تقسیم کیا۔(۳۲) سر سیّد کے نظامِ تعلیم کی یہ خامی ملی حوالے سے ان کے تصورِ قومیت کی نفی کرتی ہے کہ اس نظامِ تعلیم کی وجہ سے "ہمارے ہاں ایک ایسا طبقہ پیدا ہوا جس نے اپنی تہذیب و ثقافت کا مذاق اڑایا اور اپنے ملک اور عوام سے کٹ کر یہ حکمراں اور عوام کے درمیان استحصالی طبقہ بن گئے۔ یہی وہ طبقہ تھا جس نے آزادی کے بعد انگریزوں کی جگہ لی"(۳۳) اس کے باوجود سر سیّد کو تحریک آزادی میں سنگِ بنیاد کا درجہ دینے والے ناقدین اپنی آرا پر مصر ہیں۔

تعلیم کے بعد سر سیّد نے قومیت کے حوالے سے جس دوسرے عنصر کی اصلاح کی وہ مذہب تھا۔ وہ انگریزوں اور مسلمانوں میں حائل خلیج کو کم کرنا چاہتے تھے اور اس کے لیے "سر سیّد نے مذہبی معاملات میں عقلیت پسندی، کشادہ ذہنی اور بے تعصبی کو رہبر بنا کر مسائل کو حل کرنا چاہا۔"(۳۴) اسی وجہ سے انھیں مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کہ ان کی اصلاح کے کچھ پہلو اسلام سے متضاد و متصادم بھی تھے اور سر سیّد نے جس علم کلام کی بنیاد رکھی ان کے حوالے سے ناقدین کی آرا بھی ایسی ہیں کہ تسلیم کیے بنا چارہ نہیں۔ ڈاکٹر ظفر حسن لکھتے ہیں:

"سر سیّد کچھ اپنی ہی دھن میں رہتے تھے۔ اپنے ہی اصول گھڑتے رہتے تھے۔ عقل پسندی سے اتنے متاثر تھے کہ شریعت کے اصول اور احکامات کو منطقی طور پر ثابت کرنا

چاہتے تھے۔ تفسیر کے اصولوں اور احکامات کو نئے سرے سے بنایا۔ قرآن کو نئے معنی پہنانے کی کوشش کی، حدیث اور معجزوں سے انکار کیا۔"(۳۵)

مگر سوال یہ ہے کہ مذہب میں ایسی پیوند کاریوں کی گنجائش ہوتی ہے؟ معاشرے اور ملّت کے تشکیلی عناصر میں یہ سب سے حساس نوعیت کا حامل ہے۔ سر سیّد اگر عورتوں کی تعلیم کے حوالے سے اتنے روایت پرست تھے مذہبی حوالے سے اس ذہنی کشادگی سے کیا مقصود تھا، انگریزوں کی حمایت؟ عمیق نظری سے دیکھا جائے تو مذہبی عقاید میں راسخ ہونا ہی اسبابِ بغاوت ہند کا مرکزی و کلیدی سبب تھا۔ اس لیے اسے کم زور کرنا بھی ضروری تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سر سیّد نے اس مذہبی پہلو کی شدت کو انگریزوں کی حمایت میں کم کیا ہو۔

اس کے باوجود سر سیّد کے عہد کے کچھ ایسے لوگ بھی تھے جو "سر سیّد کو برخلاف اس وقت کے عالموں اور مذہب پرستوں کے سچا مسلمان، اسلام کا شیدائی اور مسلمانوں کا رہنما سمجھتے تھے اور بعض باتوں میں ان سے اختلاف رکھنے کے، ان کے ان مذہبی اصلاحوں کے بڑے قدر دان تھے جو سر سیّد کر رہے تھے۔"(۳۶) مولانا الطاف حسین حالی کا اس حوالے سے یہ بھی اعتقاد تھا کہ "وہ (سر سیّد) ہم میں پہلا شخص تھا جس نے مذہبی لٹریچر میں نکتہ چینی کی بنیاد ڈالی۔"(۳۷) اس نکتہ چینی اور سر سیّد کے دیگر افکار کے حوالے سے ایک شکایت یہ بھی ہے کہ سر سیّد اعتدال پسندی کا ثبوت دینے میں ناکام رہے ہیں۔ انھوں نے مذہب کی رو سے انگریزوں کے اقتدار کو جواز فراہم کیے، آیات و احادیث کی روشنی میں ان کی حاکمیت کو مقامی لوگوں کے اذہان پر ثبت کرنے کی شعوری کوشش کی۔(۳۸) ان کی مذہبی تاویلات نے ان کی شہرت اور ان کے مقصد کو نقصان پہنچایا مگر اس کے باوجود "وہ ایک بات کو حق اور قوم کے لیے مفید جانتے ہوئے کس طرح اس کی تکمیل سے باز رہتے۔"(۳۹) سوال یہ ہے کہ مقامی لوگوں کا اپنے مذہب، ثقافت اور روایت میں ترمیم کر کے انگریزوں کی باادب رعایا ثابت ہونا انگریزوں کے حق میں مفید تھا یا مسلمانوں کے حق میں؟۔ اپنی تعلیم، اپنی زبان، اپنی ثقافت اور اپنے مذہب میں انگریزوں کی حسبِ منشا تبدیلیاں کر کے ایک امن پسند رعایا بننے میں ہمارا احساسِ قومیت اور ملّت کیسے برقرار رہ سکتا تھا؟ سر سیّد کی ان مذہبی تاویلات نے امتِ مسلمہ کے غیض و غضب کو آواز دی۔ اس حوالے سے ۸۹۸۱ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانگرس کے اس جلسے کا ذکر کرنا بھی ضروری ہے جس میں مولوی بشیر الدین نے کاکس کی شاملِ نصاب ہسٹری کی کتاب میں توہین آمیز مواد کی طرف توجہ مبذول کرائی تھی۔ سر سیّد احمد خان نے اس اجلاس میں جو خطاب کیا وہ واضح انداز میں ان کے مذہبی خیالات کی ترجمانی کرتا ہے کہ وہ ہر صورت انگریزوں کے ساتھ صلح کا رویہ رکھنا چاہتے تھے۔ سوال یہ بھی ہے

کہ سر سیّد کو جن خیالات کی وجہ سے "صدیق و زندیق"[۴۰] جیسے متضاد المعنی خطابات ملے کیا ان کی تبلیغ علی گڑھ میں کی؟ تہذیب الاخلاق کا داخلہ علی گڑھ میں ممنوع تھا مگر اس میں شک نہیں کہ اس ادارے نے نوجوان نسل کو ذہنی و فکری کشادگی عطا کی۔ انگریز معلموں کو کالج کا جزو لاینفک بنا کر مسلمانوں کا ان سے ربط بڑھانے کی کاوشیں کی گئیں۔ خود سر سیّد کی شخصیت کالج کے طالب علموں کے لیے بے حد متاثر کن رہی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر رشید احمد صدیقی جس انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں، ان کی مرعوبیت واضح محسوس کی جاسکتی ہے:

"سر سیّد اور علی گڑھ کے بارے میں بیش تر علما کرام روزِ اول سے آج تک بالجہر اور کبھی بالسّر یہ خیال ظاہر فرماتے آ رہے ہیں کہ دونوں نے دنیا دین کے خد و خال کو بگاڑا اور اس میں شوشے اور گوشے نکالے کہ ان کا سدِ باب یا اصلاح کرنے کے لیے مخصوص ادارے قائم کرنے پڑے۔ اتنا شائد کافی نہ تھا کہ سیاست کے بعض ہم جولیوں نے یہ نعرہ بلند کیا کہ علی گڑھ نے قوم کے نونہالوں کو حکومت کی غلامی میں دے دیا۔ ان بشارتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ علی گڑھ نے مسلمانوں کو نہ دین کا رکھا نہ دنیا کا۔ کتنے شب و روز اور مہ و سال اس نالہ نفیر کو سنتے گزار دیئے۔ ان دوران میں علی گڑھ نے ہماری دین و دنیا کے ساتھ جیسا سلوک کیا اور اس سے ہم نے جو فائدہ اٹھایا اور جیسی آبرو اور تقویت پائی، ان کی تفصیل آساں نہیں۔"[۴۱]

واضح ہے کہ سر سیّد اور علی گڑھ کے بارے میں لوگوں کی آرا سے یہ طالب علم بیگانے نہ تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سر سیّد کے اس اندازِ فکر اور نظریہ تعلیم کے بعد مذہب سے بیگانگی کی روش دیکھنے کو ملی۔ قومیت میں عقیدہ سب سے حساس ستون تصور کیا جاتا ہے۔ اس اصلاح کے نام پر اس کی ترمیم اتنی آسان اور معمولی بات نہ تھی، جتنا سر سیّد تصور کرتے تھے۔ اس نے اتحاد کے بجائے مسلمانوں کو دو طبقوں میں تقسیم کر دیا۔ ایک روایت پسند اور دوسرے جدت پسند۔ یہی طبقات سر سیّد کے تعلیمی افکار نے بھی تخلیق کیے۔ افکارِ سر سیّد کا تیسرا پہلو سیاسی تھا۔ اسی میں ان کی ادبی حیثیت کا شمار بھی کیا جاسکتا ہے کہ ڈاکٹر سیّد عبد اللہ کے یہ قول "ان کی ادبی حیثیت ان کی سیاسی حیثیت کے تابع ہے"[۴۲] اس حوالے سے سر سیّد نے تاریخ سر کشی بجنور مرتب کی کہ اس وقت انصرام و انتظام سر سیّد کے ہاتھ میں تھا۔ غدر کے بعد بہت سے مسلمان صرف سر سیّد کی وجہ سے سزاؤں سے بچ گئے کہ

سر سیّد اس تحقیقاتی کمیشن کے واحد مقامی ممبر تھے اور اس ممبر ہونے کی وجہ دراصل کیا تھی۔ اسی تاریخ میں مندرج یہ جملے اس حقیقت کو عیاں کرنے کے لیے کافی ہیں:

> "ہم اپنے دل کا حال بیان کرتے ہیں کہ جناب مسٹر الیگزنڈر شیکسپیئر صاحب بہادر دام اقبالہ جو اخلاق اور عنایت ہمارے حال پر فرماتے تھے ان اخلاقوں اور عنایتوں نے ہمارے دل میں ایسی محبت ان صاحبوں کی ڈال دی تھی کہ ان صاحبوں کی خدمت گزاری میں ہم اپنی جان کی کچھ بھی حقیقت نہیں سمجھتے تھے۔۔۔۔اگر خدانخواستہ برا وقت آوے تو اول ہم پروانوں کی طرح قربان ہو جاویں پھر جو ہو سو ہو۔"(۴۳)

سر سیّد نے انگریزوں کو 'میرے آقا' اور باغیوں کو 'مفسد، حرام زادے اور نمک حرام' تک لکھا ہے۔ یاد رہے کہ ان باغیوں میں زیادہ مسلمان تھے۔ سر سیّد بغاوت کی لڑائی کا حال کمال داستانوی انداز میں یوں بیان کرتے ہیں:

> "فتح و نصرت نصیب اولیائے دولت سرکار ہوئی۔ اس معرکہ میں چار سو آدمی تخمیناً باغیوں کا مارا گیا۔۔۔۔۔ سرکاری فوج میں کسی شخص کے پھول کو چوٹ بھی نہیں آئی"(۴۴)

سیاسی حوالے سے رسالہ اسبابِ بغاوتِ ہند بھی سر سیّد کی ملی کاوشوں کی فہرست میں شمار کیا جاتا ہے۔ صرف یہ رسالہ ہی نہیں اہلِ فکر کو تو سر سیّد کی تحریر کا ہر ایک لفظ، فکر کا ہر ایک زاویہ اور مزاج کا ہر ایک پہلو قومیت و وطنیت کی نمود کرتا نظر آتا ہے۔ ڈاکٹر رشید احمد صدیقی اپنے مضمون "سر سیّد اور علی گڑھ" میں لکھتے ہیں:

> "سر سیّد نے شروع سے آخر تک تحریر و تقریر سے، برتاؤ سے، کالج کے ذریعہ ہر جا اور ہمہ وقت ابنائے وطن کو اپنانے کی کوشش کی اور اخلاص و یگانگت کے اظہار میں وہ سب کہتے اور کرتے رہے جس کا عشر عشیر بھی غیر مسلم لیڈروں میں سے کسی نے مسلمانوں کے حق میں غدر سے لے کر گاندھی جی کے وقت تک نہ کیا نہ کہا۔"(۴۵)

اسبابِ بغاوت ہند کا نام خود ایک تجزیہ کا متقاضی ہے۔ جنگِ آزادی کو فساد یا بغاوت کا نام دینا ہی یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ وہ لڑائی آوازِ حق نہیں بل کہ نعرہ تخریب تھی۔ بلاشبہ اس پر "انگریز بہت برہم ہوئے اور انھیں باغی اور قابلِ دار سمجھا گیا"(۴۶) مگر جب اس رسالے کو توجہ سے پڑھا گیا تو یہ انکشاف ہوا کہ یہ تو دراصل

انگریزوں کو مسلمانان ہند پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے گر سکھانے کی ایک کاوش ہے۔اس رسالے میں سر سیّد جس عاجزانہ انداز میں اسباب گنوا کر جس خلوص سے ان کے حل تجویز کرتے ہیں وہ قابلِ غور ہے۔وہ انگریزوں کا تقابل مغل حکمرانوں سے کر کے انگریزوں کو ان کی خامیوں سے مطلع کرتے ہیں۔دراصل اس رسالے کا یہی وہ انداز تھا جس نے سر سیّد کو انگریزوں کے عتاب سے بچایا اور ہمارے ناقدین اسبابِ بغاوتِ ہند کی وجہ سے سر سیّد کو قومی رہنما خیال کرتے ہیں۔لیکن جو لوگ اس سے برعکس فکر کے حامل ہیں ان کی آرا بھی لائق توجہ ہیں۔ڈاکٹر ظفر حسن لکھتے ہیں:

"دراصل "قدیم" کے معاملے میں "جدید" کو کھڑا کر کے دونوں کا باہم ٹکرا دینا انگریز کی کامیاب سیاست تھی۔وہ نہیں چاہتا تھا کہ مسلمانوں کے دین کو جبراً مٹانے کی "بدنامی" اپنے سر لے۔اس نے لوہے کو لوہے سے کاٹنے کی حکمتِ عملی اختیار کی اور ہمدردانِ قوم مسلمانوں کو ڈھونڈ نکالا جو انگریز کے مجوزہ خاکے میں رنگ بھریں۔چناں چہ "سر" اور "بہادروں" نے بڑے اخلاص سے یہ خدمت انجام دی۔درحقیقت اسی سے مسلمان کے باہمی افتراق و انتشار کی ابتدا ہوئی۔"[۴۷]

اسی تناظر میں سر سیّد پر انگریز نواز ہونے اور انگریزوں کا آلہ کار بننے کا بھی الزام لگایا گیا۔سر سیّد انگریزوں کی حمایت و خوشامد میں اعتدال پسندی کا ثبوت دینے میں ناکام رہے۔ان کے خطبات و مقالات میں بارہا مسلمانانِ ہند کو انگریزوں کی شکر گزاری پر اکسایا گیا ہے۔سر سیّد نے خود بھی اپنے ایسے تشکر آمیز خیالات کا اظہار کیا ہے جن سے ان کا احساسِ کم تری عیاں ہوتا ہے۔تاریخِ سرکشی بجنور میں سر سیّد لکھتے ہیں:

"جب ضلع ہمارے سپرد ہوا تو میری یہ رائے تھی کہ پرانے لفظ منادی کے یعنی "خلق خدا کی،ملک بادشاہ کا،حکم کمپنی بہادر کا" بدلے جاویں اور بجائے ملک بادشاہ کا پکارا جاوے کہ ملک ملکہ معظمہ وکٹوریہ شاہ لندن کا۔کیوں منادی میں ایسے الفاظ چاہیں کہ جن سے عوام الناس بغیر شک کے یہ بات سمجھے کہ درحقیقت ملک کس کا ہے اور ہمارا بادشاہ کون ہے اور ہم کس کی رعیّت ہیں۔"[۴۸]

سر سید نے ملکہِ برطانیہ کو "شہنشاہِ ہند" کا خطاب تجویز کرنے کی پر زور فرمائش کی۔[۴۹] نیز سر سیّد بجنور کے ہنگامہ خونی کو ہندستانیوں کی ناشکری کا وبال قرار دیتے ہیں۔[۵۰] سر سیّد نے اس مغل بادشاہ کہ کم بخت کہا ہے

جس سے خطاب پایا تھا تو یہ کہاں کی نمک حلالی ہے؟ جب کہ مسلمانوں کے حوالے سے ۱۸۵۷ء کے واقعے کے تناظر میں لکھتے ہیں:

"پھر اس ہنگامے میں جہاں عیسائیوں کا خون گرتا، وہیں مسلمانوں کا خون بھی گرنا چاہیے تھا۔ پھر جس نے ایسا نہیں کیا اس نے نمک حرامی اور گورنمنٹ کی ناشکری کے جو ہر ایک رعیّت پر واجب ہے اپنے مذہب کے بھی بر خلاف کیا۔ پھر وہ بلاشبہ اس لائق ہیں کہ ان سے ناراض ہوا جاوے۔"(۵۱)

گویا لوگ سر سیّد کو انگریزوں کا حواری اور آلہ کار تصور کرنے میں اتنے بے جا بھی نہیں تھے۔ اس کے باوجود ناقدین کا ایک گروہ سر سیّد کے اس پہلو کو پاکستانیت کے تناظر میں اجاگر کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ ڈاکٹر وحید قریشی اپنے مضمون "سر سیّد پاکستان کے معمارِ اول" میں لکھتے ہیں:

"ایک طبقے کا خیال اس وقت یہ تھا کہ سر سیّد احمد خان دراصل حکومت کے حواری ہیں اور وہ خوشامد کا راستہ اختیار کر کے مسلمانوں کو انگریزوں کا ہم خیال بنانا چاہتے ہیں۔ سر سیّد خوشامد پسند نہ تھے نہ انھوں نے سرکار انگریزی کے لیے کسی نرم گوشے کا اظہار کیا۔ انگریز مورخین کی غلط باتوں کی تردید کے لیے وہ انگلستان گئے اور خطباتِ احمدیہ جیسی کتاب لکھی اور انگریزوں کی بعض پالیسوں کی مخالفت بھی کی۔ آل انڈیا کانگرس برطانوی حکومت کی تائید اور شہ پر قائم ہوئی تھی۔ کانگرس کے قیام کے پانچ سال بعد ہی سر سیّد احمد خان نے یہ احساس کر لیا تھا کہ مسلمانوں کو من حیث الجماعت کانگرس سے الگ رہنا چاہیے۔"(۵۲)

نرم گوشے کا اظہار نہ کرنے والی بات تاریخ سرکشی بجنور کے سامنے متزلزل ہوتی نظر آتی ہے۔ کانگرس کے حوالے سے دیکھا جائے تو دراصل سر سیّد مسلمانانِ ہند میں سیاسی بیداری اجاگر کرنے کے مخالف تھے کہ اصل میں وہ مسلمانانِ ہند کو باادب اور مودب رعایا بنانا چاہتے تھے۔ وہ کسی ایسے عمل کی حمایت کر ہی نہیں سکتے تھے جس سے انگریزوں کو پھر تصادم کا سامنا کرنا پڑے۔ کانگرس کے حوالے سے سر سیّد اپنے مقالات میں لکھتے ہیں:

"مگر ان کو (جو کانگرس کی حمایت میں حکومت پر تنقید کر رہے ہیں) سمجھ لینا چاہیے کہ اگر بالفرض ہندستان کے تمام ہندو اور مسلمان نیشنل کانگرس کے ساتھ ایجی ٹیشن میں

> شریک ہو جاویں اور تمام ہندو اور مسلمانوں کے مضامین خلافِ واقع اور بر خلاف گورنمنٹ لکھنے پر متفق ہو جاویں تو بھی گورنمنٹ کا کچھ نقصان نہیں ہونے کا، ہاں یہ امر مجبوری گورنمنٹ کو دائرہ آزادی کو اس وقت سے زیادہ تنگ کرنا پڑے گا۔"(۵۳)

پھر سر سیّد کی پوری زندگی میں صرف ایک مثال ایسی ملتی ہے کہ انھوں نے کسی انگریز پر برہمی کا اظہار کیا ہو۔ علی گڑھ کالج میں مسٹر بیک کو جب طالب علموں کے لیے سر سیّد کا تجویز کردہ لباس اور ترکی ٹوپی پسند نہ آئی تو ڈرم کلاس کے لیے انھوں نے ریشمی بھڑکیلے رنگوں والا لباس منتخب کر لیا۔ اس پر سر سیّد نے مسٹر بیک کو اسٹیج پر بیٹھا کر خطبے میں واضح کیا کہ "ہندستان میں بعض کوتاہ نظر یا مغرور اور کم بیں انگریز جو ہندستانیوں کر ذلیل رکھنا چاہتے ہیں یا ذلت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں ایسے ہیں جو ٹوپی کوٹ اور بوٹ پہننے پر اعتراض کرتے ہیں"(۵۴) یہاں یہ امر بھی ملحوظ رہے کہ مسٹر بیک علی گڑھ کے معلم ہونے کی حیثیت سے سر سیّد کے تنخواہ دار ملازم تھے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی نے بھی سر سیّد کی اس انگریز پرستی سے قومیت کے چند پہلو دریافت کیے ہیں۔ جن سے انکار کرنا محال ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> "سر سیّد احمد خان نے انگریز حکومت کے ساتھ وفاداری کا پورا پور افائدہ اٹھایا۔ علی گڑھ چھاونی کا وسیع و عریض رقبہ حاصل کیا۔ انڈین کونسلز ایکٹ میں نامزدگی کے حق میں ترمیم کروائی اور ۱۸۹۲ء کے ایکٹ کی رو سے مرکزی اسمبلی کے ۴۲ ارکان میں ۴۱ سرکاری اور ۵ نامزد ارکان اور ۴ منتخب کی تعداد مقرر کروانے میں بھی انھوں نے کافی دوڑ دھوپ کی۔"(۵۵)

ان حقائق سے انکار نہیں مگر اس کا تعلق ان کے ملی رجحان سے نہیں ہے اور ان کا تقابل اگر ان کی انگریزوں کے لیے کی جانے والی کاوشوں سے کیا جائے تو سر سیّد کی کاوشوں کا پلڑا بھاری ہو گا۔ یہاں افتخار عالم خان کا یہ کہنا بھی لائق مطالعہ ہے کہ "۱۸۵۷ء سے پہلے تک سر سیّد کی انگریزوں کے تئیں مرعوبیت نے انھیں انگریزوں کا گرویدہ بنادیا تھا۔۔۔۔۔۱۸۵۷ء کے بعد ان کی انگریزوں کے تئیں وفاداری، خود از روے اختیار منتخب نہیں کی گئی تھی بل کہ اب یہ سر سیّد کی مجبوری بن گئی تھی۔"(۵۶) سر سیّد کے قومی و ملی رجحان کو پرکھتے ہوئے ایک حیرت انگیز رویہ بھی لائق توجہ ہے۔ سر سیّد مسلمانانِ ہند کے لیے جس تحقیر آمیز انداز میں بات کرتے ہیں وہ فہم سے بالاتر ہے۔ سر سیّد نے جس طرح انگریزوں کی بے جا حمایت کی ہے اسی طرح مسلمانانِ ہند کی بے جا تحقیر کی ہے۔ اپنے ہی لوگوں کو نامہذب، مرکبِ جہل اور اسی طرح کے دیگر خطابات عطا کرنے والی شخصیت کو کیوں کر تحریکِ پاکستان کا رہ نما

تصور کیا جا سکتا ہے؟ سر سیّد انگریزوں اور ہندستانیوں کا تقابل بھی بڑے دل چسپ انداز میں کرتے ہیں۔ اپنے سفر نامے مسافرانِ لندن میں وہ لکھتے ہیں "تمام ہندستانیوں کو اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک، امیر سے لے کر غریب تک، سوداگر سے لے کر اہلِ حرفہ تک، عالم فاضل سے لے کر جاہل تک انگریزوں کی تعلیم وتربیت اور شائستگی کے مقابلے میں در حقیقت ایسی ہی نسبت ہے جیسی لائق اور خوب صورت آدمی کے سامنے نہایت میلے کچیلے وحشی جانور کو"(۵۷) اسی طرح مقالات میں سر سیّد انڈین آبزرور میں لکھے گئے ایک کالم پر یوں تبصرہ کرتے ہیں کہ "ہماری یہ رائے ہے کہ اس زمانے میں مسلمانوں کی ایسی حالت ہے کہ جو لفظ سخت اور خراب سے خراب ان کی نسبت استعمال کیے جائیں وہ سب درست اور بجا ہیں اور اسی سبب سے ان اَن سویلائزڈ الفاظ سے جو انڈین آبزرور میں آرٹیکل لکھنے والے نے ہم مسلمانوں کی نسبت لکھے ہیں ہم کو کچھ ناراضی نہیں ہوتی۔۔۔۔۔۔ ہمارے زمانے کے علم کے دیوتا نے ہماری نسبت کیا کہا ہے۔ ان کو (یعنی مسلمانوں کو) گورنمنٹ کی ذات سے یہ توقع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ سور کے بالوں سے ریشم کی تھیلی بنادے"(۵۸)

تاریخ شاہد ہے کہ انڈین آبزرور کا یہ تحقیر آمیز بیان قریباً ہر تیسرے انگریز کے افکار تھے اور اس سے مسلمانوں کا کم تر ہونا اتنا نہیں جھلکتا، جتنا انگریز انگلشیہ کی فرعونیت جھلکتی ہے۔ کہاں لکھا تھا کہ مہذب ہونے کا معیار انگریزی تعلیم، انگریزی ثقافت اور انگریزی زبان تھا۔ اگر تھا بھی تو پھر سر سیّد بھی انگریزی زبان و تعلیم سے نابلد تھے۔

سر سیّد کو دو قومی نظریے کا بانی بھی تصور کیا جاتا ہے کہ انھوں نے اس حقیقت کو تسلیم کروایا کہ برِصغیر میں دو مختلف مزاج کی قومیں بستی ہیں۔ گویا ایک طبقے کا خیال یہ تھا کہ "سر سیّد احمد پہلے قومی رہ نما تھے جنھوں نے دو قومی نظریے اور مسلمانوں کی علیحدہ مسلم قومیت کے تصور کو برصغیر میں رائج کیا اور ہندستان کے مسلمانوں کے شعور کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔ جس کی بنا پر انھیں متفقہ طور پر دو قومی نظریے کا اولین داعی اور علم بردار کہا جاتا ہے"(۵۹)

دو قومی نظریے کا سب سے کلیدی ستون مذہب تھا۔ جس کی رو سے برصغیر میں دو قومی نظریے کا سوال اٹھا تھا۔ مگر کچھ ناقدین کے خیال میں سر سیّد کا یہ دو قومی نظریہ مذہبی بنیادوں پر استوار نہیں تھا۔ اس کی بنیاد طبقاتی تفاوت پر تھی۔ اس حوالے سے زاہد چوہدری کا خیال ہے کہ مسلمان مورخین جو یہ خیال کرتے ہیں کہ سر سیّد نے دو قومی نظریے کا تصور پیش کر کے تحریکِ پاکستان کی بنیاد رکھی وہ سر سیّد کی ۱۸۸۱ء میں کی گئی تقاریر کا حوالہ نہیں

دیتے جن میں سر سیّد نے مذہب کو دنیاوی امور سے بے تعلق تصور کرتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں کو باعتبار وطن ایک قوم تصور کیا ہے۔ یہ مسلم مورخین سر سیّد کی میرٹھ اور لکھنو والی تقاریر میں سے ان حصوں سے بھی صرفِ نظر کر جاتے ہیں جن میں انھوں نے ہندستان کے عوام کو مذہب کی بنیاد پر تقسیم نہیں کیا بل کہ اس برصغیر کو ایک کثیر الاقومی بل کہ کثیر الممالک خطہ قرار دیا تھا۔ وہ اس حقیقت کا ذکر بھی نہیں کرتے کہ مارچ ۱۸۸۸ء سر سیّد نے پٹریاٹک اسوسی ایشن جیسی غیر فرقہ وارانہ جماعت قائم کی۔ جس کا نصب العین صرف مسلمانوں کے مفادات کا تحفظ تو قطعاً نہیں تھا۔(۶۰)ان دلائل کی روشنی میں وہ یہ نتائج اخذ کرتے ہیں:

"گویا اس کے دو قومی نظریے کی بنیاد قومیتی اور طبقاتی دونوں ہی قسم کے تضادات پر تھی۔ اس نظریے کی بنیاد اس نعرے پر نہیں تھی کہ اسلام خطرے میں ہے۔"(۶۱)

اور پھر اپنے مقالات میں سر سیّد واضح طور پر یہ بیان کر چکے ہیں کہ یتیم اور لاوارث بچوں کو پادریوں کی کفالت میں سونپ کر انھیں عیسائی بنایا جا رہا ہے۔(۶۲)کم آباد اور ویران جگہوں پر بھی مشنری سکول قائم کیے جا رہے ہیں۔(۶۳)اس کے باوجود سر سیّد کو اسلام خطرے میں نظر نہیں آتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ "سر سید کی اس نئی تعلیمی تحریک کے مخاطب مسلمان تھے مگر اس کی انتظامی اور تعلیمی اساس سیکولر تھی۔"(۶۴)یہ بھی حقیقت ہے کہ "سر سید کا سیاسی مسلک یہ بھی تھا کہ ہندو مسلمان ایک ہو کر رہیں۔ انھوں نے ہندو مسلم نفاق کو کبھی نہیں سراہا اور ہمیشہ باہمی تعلقات پر زور دیتے رہے۔(۶۵)دراصل یہ حقیقت سر سیّد کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھی کہ انگریزوں کو کبھی یہ خطہ چھوڑنا بھی پڑ سکتا ہے۔ اس لیے ان کا سارا زور ہندستانیوں کو بہتر و مہذب رعایا ثابت کرنے پر تھا نہ کہ مسلمانانِ ہند کی ملی اساس کو سنوارنے اور اس کی افزائش کرنے پر۔ دوسرے لفظوں میں وہ مسلمانانِ ہند کو محکومی کے گر سکھا رہے تھے اور قومیت کے لیے یہ مناسب طرزِ عمل تصور نہیں کیا جاتا۔ اس کے باوجود ناقدین کا اسی امر پر اتفاق ہے کہ برصغیر کو قوم اور مسلمانانِ ہند کو قومیت کا تصور سر سید احمد خان نے دیا۔ وہ قطعی انداز میں یہ موقف اختیار کرتے ہیں۔ کہنے والے خواہ کچھ ہی کہیں ان کے لیے اس حقیقت سے انکار محال ہے کہ "سر سید قوم کے عیبوں پر پردہ ڈالنے والے محبِ وطن نہ تھے۔ بل کہ وہ اپنی قوم کے ایسے محب اور خیر خواہ تھے جو ان عیبوں کو مٹانا قوم کی صحیح خدمت تصور کرتے تھے اور جن کو قوم کی حالت بے چین و بے قرار کر دیتی تھی۔(۶۶)سر سید نے جن عیوب کی نشان دہی کی ہے ان میں انگریزی زبان و ادب سے لاعلمی، رسوم و رواج کی اندھی تقلید، کنویں کا مینڈک بنے رہنا، انگریزی ثقافت کو اچھا تصور نہ کرنا جیسے عیوب قابلِ ذکر ہیں۔

سر سیّد نے اپنی شعوری کاوشوں سے دو قومی نظریے کو کسی حد تک رد کرتے ہوئے سیکولر ہندستان کی حمایت کی۔ اس کے باوجود ناقدین کو سر سیّد احمد خان کے افکار و کردار سے مسلمانانِ ہند کی ملی نمود ہوتی نظر آتی ہے۔ ڈاکٹر محمد علی صدیقی کے خیال میں "سر سید احمد خان نے در حقیقت مسلمانوں کے علیحدہ سیاسی وجود کو تسلیم کروایا"(۶۷) مولوی عبد الحق کا خیال ہے کہ "اس (سر سید) نے قوم بنائی، قومیت کا تصور پیدا کیا۔ مردہ دلوں میں روح پھونکی۔"(۶۸) سیاسی وجود کو تسلیم کروانے کے حوالے سے پھر بھی کچھ حقائق نظر آتے ہیں مگر مولوی عبد الحق صاحب جس روح کا تذکرہ کر رہے ہیں ناقدین اس کی توجیح قدرے مختلف انداز سے کرتے ہیں۔ اس حوالے سے غلام کبریا اپنی تصنیف آزادی سے پہلے مسلمانوں کا ذہنی رویہ میں لکھتے ہیں:

> "یہ بیان جس کی رو سے سر سیّد کو "دو قومی نظریے کا خالق قرار دیا گیا یعنی سارے مسلمان ایک قوم ہیں اور سارے ہندو دوسری قوم۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ سر سیّد نے بہت سے موقعوں پر ہندستانی مسلمانوں کو ایک قوم کہا تھا لیکن اس کے معنی وہ نہ تھے جو مغرب میں رائج ہیں۔ اس وقت قوم سے ان کی مراد یا تو ذات تھی یا برادری۔"(۶۸)

دیگر ناقدین نے بھی سر سیّد کے تصورِ قوم کی ایسی ہی وضاحت کی ہے۔ ڈاکٹر مبارک علی ان کے تصورِ قوم کو مزید محدود کرتے ہوئے سر سیّد کے قومی کردار کو ہی مشکوک ٹھہراتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> "سر سیّد نے مفاہمت، تعاون اور وفاداری کی جو تعلیم دی اس کے ذریعے وہ مسلمانوں کے خاص طبقے کو فائدہ پہنچانا چاہتے تھے اور یہ طبقہ مسلمان امرا اور جاگیر داروں کا تھا۔ جب وہ لفظ قوم استعمال کرتے تو ان کے سامنے اسی محدود طبقے کے مفادات ہوتے تھے۔ مسلمان عوام کے نہیں۔"(۶۹)

ڈاکٹر شان محمد سر سیّد کو ایک ایسا نیشنلسٹ قرار دیتے ہیں جو سارے ہندستان کو اپنا وطن تصور کرتا ہے۔ ان کے یہاں صرف مسلمانوں کی سوچ کبھی نہ ابھری۔ اپنی تصنیف کے دیباچے میں وہ لکھتے ہیں:

> "Sir Sayed is the most misunderstood political figure in the Modern Indian politics. Some Indian writers call him a sectarian, while writers of Pakistan contend that he was the father of the two-nation theory and consequently the

first advocate of the idea of Pakistan. The present study of Sir Sayed's writings has led me to the conclusion that both the above stand points are ill founded and inaccurate _ _ _ _ He never claimed that Muslims were a separate nation. on the contrary he always considered Hindus and Muslim as "the two eyes" of the mother India. All available evidence goes to show that he was a nationalist. He had a secular outlook. (70)

شان محمد کا یہ اقتباس ہی اصل میں سر سیّد کے تصورِ قومیت کا بجا اظہار ہے۔ سر سیّد احمد خان نے خود بھی اپنے نیشنلسٹ ہونے کا برملا اعتراف کیا ہے۔ جس کے بعد ان کے تصورِ قومیت کو ملّت سے وابستہ کرنا کسی صورت منطقی معلوم نہیں ہوتا۔ سر سیّد نواب محسن الملک کے نام اپنے ایک خط میں واضح الفاظ میں اپنے نیشنلسٹ ہونے کا پتا دیتے ہیں:

"ایک اور خبر مجھے ملی ہے جس کا مجھ کو کمال رنج اور فکر ہے کہ بابو شیوا پرشاد صاحب کی تحریک سے عموماً ہندو لوگوں کے دل میں جوش آیا ہے کہ زبانِ اردو و خطِ فارسی کو، جو مسلمانوں کی نشانی ہے مٹا دیا جائے۔۔۔ یہ ایک ایسی تدبیر ہے کہ ہندستان میں کسی طرح اتفاق نہیں رہ سکتا۔ مسلمان ہر گز ہندی پر متفق نہ ہوں گے اور اگر ہندو مستعد ہوئے اور ہندی پر اصرار کیا تو وہ اردو پر متفق نہ ہوں گے اور نتیجہ اس کا یہ ہو گا کہ ہندو علیحدہ (اور) مسلمان علیحدہ ہو جاویں گے۔ یہاں تک تو کچھ اندیشہ نہیں بل کہ میں سمجھتا ہوں کہ اگر مسلمان ہندو سے علیحدہ ہو کر اپنا کاروبار کریں گے تو مسلمان کو زیادہ فائدہ ہو گا اور ہندو نقصان میں رہیں گے۔ اس میں صرف دو امر کا خیال ہے۔ ایک خاص اپنی طبعیت کے سبب سے کہ میں کل اہلِ ہند کیا ہندو کیا مسلمان سب کی بھلائی چاہتا ہوں۔۔۔"(۷۱)

بل کہ عمیق نظری سے دیکھا جائے تو یہ حقیقت عیاں ہوتی ہے کہ عہدِ سر سیّد ہی وہ مخصوص دور تھا جس میں مسلمانوں کے انفرادی تشخص کو مٹانے کی کوشش کی گئی۔ جنگِ آزادی سے پہلے مذہبی تحاریک کی پناہ میں اور جنگِ آزادی کے بعد سیاسی بنیادوں پر مسلمانوں کا تصورِ ملت ہی برگ و بار لاتا نظر آئے گا۔ سر سیّد احمد خان کی ذات تو دراصل اس احساسِ ملت کے پنپنے میں حائل تھی۔ جو دانستہ و نادانستہ مسلمانانِ ہند کو روزی روٹی کی فکر میں الجھا کر انھیں ایک "فریب خوردہ شاہیں" بنانے کی کوششوں میں مشغول تھی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سیّد عبد اللہ اپنی تصنیف پاکستان - تعمیر و تعبیر میں لکھتے ہیں:

> "اسلامی حکومت کو قائم کرنے کی آرزو ہر اچھے مسلمان کے دل میں رہی ہے۔ ماسوا اس دور کے جب علی گڑھ تحریک نے عارضی طور سے اسلامی حکومت کی آرزو بالکل ترک کر دی اور ہندستان کے اندر رہ کر ہندوؤں کے مقابلے میں دال روٹی کے بٹوارے کو اپنا نصب العین بنالیا۔"(۴۲)

گویا ہم کہہ سکتے ہیں کہ سر سیّد کے تصورِ قومیت کو مسلمانوں کے تصورِ ملت سے ہم آہنگ خیال کرنے والے ناقدین دراصل ان کے افکار کو مخصوص زاویے سے پرکھنے کے قائل ہیں۔ جب کہ سر سیّد کے افکار کی معنوی تفہیم کے لیے ان کی تمام جہات کو مدِ نظر رکھنا لازم ہے۔ مذکورہ مباحث و براہین کی روشنی میں ہم سر سیّد احمد خان کو بجا طور پر ایک قومیت پرست شخصیت قرار دے سکتے ہیں۔ جن کے افکار نے بلاشبہ مسلمانانِ ہند کی سماجی، معاشی اور اقتصادی ابتری کو سنبھالا دیا مگر ان کے افکار مسلمانانِ ہند میں انفرادی تشخص کا احساس اجاگر کرنے سے معذور رہے۔ یہ احساس برصغیر کے مسلمانوں میں خالصتاً سر سیّد سے پہلے اور بعد کے زمانوں کی دین ہے۔

حوالہ جات

۱۔ فیض احمد فیض: پاکستانی کلچر اور قومی تشخص کی تلاش، لاہور: فیروز سنز، ۱۹۸۸ئ، ص ۲۳
۲۔ لطیف احمد شیروانی: حرفِ اقبال، لاہور: المنار اکادمی، ۱۹۴۸ء، ص ۳۵۷، ۳۵۸
۳۔ خلیفہ عبد الحکیم، ڈاکٹر: فکرِ اقبال، لاہور: بزمِ اقبال، ۱۹۹۲ء، ص ۶۷
۴۔ شیخ محمد اکرام: موجِ کوثر، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۷۹ء، ص ۳۷
۵۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر: سر سیّد احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کی فنی جائزہ، اسلام آباد: مقتدرہ قومی زبان، ۱۹۸۶ء، ص ۱۶

۶۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): خطباتِ سر سیّد، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۷۳ء، ج اول، ص ۴۰۳

۷۔ ایضاً، ص ۶۳۵، ۴۳۶

۸۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر: سر سیّد احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کی فنی جائزہ، ص ۳۵

۹۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): مقالاتِ سر سیّد، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۔۔۔، ج اول، ص ۱۵۶، ۱۵۷

۱۰۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): مقالاتِ سر سیّد، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۹۲ء، ج نہم، ص ۱۹

۱۱۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): خطباتِ سر سیّد، ج اول، ص ۲۰۵

۱۲۔ ایضاً، ص ۵۰

۱۳۔ ایضاً، ص ۷۶

۱۴۔ ایضاً، ص ۴۵۸

۱۵۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): خطباتِ سر سیّد، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۷۳ء، ج دوم، ص ۳۶۴

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۶۴

۱۷۔ حوالے کے لیے دیکھیے مقالاتِ سر سیّد، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۹۱ء، ص ۷۹

۱۸۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): مقالاتِ سر سیّد، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۹۳ء، ج بارہ، ص ۱۵۱

۱۹۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): خطباتِ سر سیّد، ج دوم، ص ۳۶۳

۲۰۔ ثریا حسین: سر سیّد احمد خان اور ان کا عہد، علی گڑھ: ایجو کیشنل بک ہاوس، ۱۹۹۳ء، ص ۳۶۱

۲۱۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): خطباتِ سر سیّد، ج دوم، ص ۳۶۱

۲۲۔ حوالے کے لیے دیکھیے: خطباتِ سر سیّد مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، جلد اول، ص ۲۷، ۳۷

۲۳۔ ظفر حسن، ڈاکٹر: سر سیّد اور حالی کا نظریہ فطرت، لاہور: ادارہ ثقافتِ اسلامیہ، ۱۹۹۰ء، ص ۷۰

۲۴۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): مقالاتِ سر سیّد، لاہور: مجلسِ ترقیِ ادب، ۱۹۹۱ء، ج ہشتم، ص ۱۵۱

۲۵۔ صالحہ عابد حسین (مرتب): حیاتِ جاوید، لاہور: بک ٹاک، ۲۰۰۷ء، جلد دوم، ص ۲۵۱

۲۶۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): خطباتِ سر سیّد، ج دوم، ص ۲۰، ۲۱

۲۷۔ ابو الحسن ندوی، مولانا(مولف): مسلم ممالک میں اسلامیت اور مغربیت کی کش مکش، لکھنو: تحقیقات نشریات اسلام، ۲۰۰۳ء، ص ۱۰۱، ۱۰۲، ۱۰۳

۲۸۔ مبارک علی، ڈاکٹر: المیہ تاریخ، لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۱۶۱

۲۹۔ شیخ اسماعیل پانی پتی(مرتب): مقالاتِ سر سیّد، جلد ہشتم، ص ۴۷

۳۰۔ مبارک علی، ڈاکٹر: المیہ تاریخ، لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۱۵۶

۳۱۔ سید سبطِ حسن: نویدِ فکر، کراچی: مکتبہ دانیال، ۲۰۰۲ء، ص ۱۴۹

۳۲۔ "فیصلہ ہوا کہ تعلیم دو طرح کی ہو گی: عام، خاص" حوالے کے لیے دیکھیے مقالاتِ سر سید مرتبہ؛ شیخ اسماعیل پانی پتی، جلد ہشتم، ص ۹۲

۳۳۔ مبارک علی، ڈاکٹر: المیہ تاریخ، لاہور: تاریخ پبلی کیشنز، ۲۰۱۲ء، ص ۱۵۴

۳۴۔ خلیق احمد نظامی، پروفیسر: علی گڑھ کی علمی خدمات، دہلی: انجمن ترقی اردو ہند، ۱۹۹۴ء ص ۲۰

۳۵۔ ظفر حسن، ڈاکٹر: سر سیّد اور حالی کا نظریہ فطرت، ص ۴۷، ۵۷

۳۶۔ ملک راشد فیصل: حالی کی سوانح نگاری۔ حیاتِ جاوید کی روشنی میں، دہلی: ایجو کیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۷ء، ص ۶۳

۳۷۔ الطاف حسین حالی، مولانا: حیاتِ جاوید، لاہور: نیشنل بک ہاوس، ۱۹۸۶ء ص ۲۴

۳۸۔ حوالے کے لیے دیکھیے: مقالاتِ سر سیّد مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۸۴ئ، ص ۹۳،۲

۳۹۔ شیخ محمد اکرام: موجِ کوثر، ص ۱۰۳

۴۰۔ الطاف حسین حالی، مولانا: حیاتِ جاوید، ص ۲۴

۴۱۔ فصیح احمد صدیقی، ڈاکٹر، لطیف الزماں صدیقی (مرتبین): عزیزانِ علی گڑھ، ملتان: بیکن بکس، ۱۹۹۰ء، ص ۸۷

۴۲۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر: سر سیّد احمد خان اور ان کے نامور رفقا کی اردو نثر کی فنی جائزہ، ص ۱۷

۴۳۔ شیخ اسماعیل پانی پتی(مرتب): مقالاتِ سر سیّد، لاہور: مجلسِ ترقی ادب، ۱۹۹۰ء، ج ششم، ص ۲۸۶

۴۴۔ ایضاً، ص ۴۲۰

۴۵۔ طاہر تونسوی، پروفیسر (مرتب): سر سیّد شناسی، لاہور: الفیصل ناشران و تاجرانِ کتب، ۲۰۰۲ء، ص۵۹
۴۶۔ عبد الحق، مولوی: سر سیّد احمد خان: حالات و افکار، کراچی: انجمن ترقی اردو پاکستان، ۱۹۵۹ئ، ص ۱۸۲
۴۷۔ ظفر حسن، ڈاکٹر: سر سیّد اور حالی کا نظریہ فطرت، ص۶۷
۴۸۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): مقالاتِ سر سیّد، جلد ہشتم، ص۴۷
۵۰۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): مقالاتِ سر سیّد، لاہور: مجلس ترقیِ ادب، ۱۹۹۰ء، ج ہفتم، ص۴۵
۱۵۔ ایضاً، ص۴۱
۵۲۔ طاہر تونسوی، پروفیسر (مرتب): سر سیّد شناسی، ص۸۸
۵۳۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): مقالاتِ سر سیّد، ج نہم، ص۱۸
۵۴۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): خطباتِ سر سیّد، ج دوم، ص ۲۶۵
۵۵۔ محمد علی صدیقی، پروفیسر: سر سیّد احمد خان اور جدت پسندی، کراچی: اسپرائوٹ کمپیوٹر گلشنِ اقبال، ۲۰۰۲ء، ص۵۷
۵۶۔ افتخار عالم خان: سر سیّد درونِ خانہ، علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۶ء، ص۶۷
۵۷۔ اصغر عباس (مرتب): مسافرانِ لندن، علی گڑھ: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس، ۲۰۰۹ئ، ص۱۴۷
۵۸۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): مقالاتِ سر سیّد، ج نہم، ص۲۰۹، ۲۰۸
۵۹۔ طاہر تونسوی، پروفیسر (مرتب): سر سیّد شناسی، ص ۳۴۶
۶۰۔ زاہد چوہدری، (مرتب): سر سیّد احمد خان، لاہور: ادارہ مطالعہ تاریخ، ۱۹۹۹ء، ص۱۵۵، ۱۵۶
۶۱۔ ایضاً، ص۱۵۷
۶۲۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): مقالات سر سید، لاہور، مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۰ء، پنجم، ص۱۲۹ تا ۱۴۴
۶۳۔ حوالے کے لیے دیکھیے: مقالات سر سید، مرتبہ شیخ اسماعیل پانی پتی، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۹۳ء، جلد بارہ، ص۱۴۳، ۱۵۶
۶۴۔ عتیق احمد صدیقی (مرتب): سر سید یافت، علی گڑھ: سر سید اکادمی، ۱۹۹۰ء، ص۲۵۳
۶۵۔ ایضاً، ص۱۶۵
۶۶۔ شاہد حسین رزاقی: اصلاح معاشرہ، لاہور: ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۶۳ء، ص ۲۲

۶۷۔ محمد علی صدیقی، پروفیسر: سرسید احمد خان اور جدت پسندی، ص۵۸

۶۸۔ طاہر تونسوی، پروفیسر، (مرتب): سرسید شناسی، ص۴۷

۶۹۔ مبارک احمد، ڈاکٹر: المیہ تاریخ، ص۱۵۰، ۱۵۱

70- Shan Muhammad: Sir Syed Ahmad Khan: A Political Biography, Lahore: University Books, DNM, Preface

۷۱۔ شیخ اسماعیل پانی پتی (مرتب): مکتوبات سرسید، لاہور: مجلس ترقی ادب، ۱۹۷۶ء، جلد اول، ص۴۶۳، ۴۶۴

۷۲۔ سید عبد اللہ، ڈاکٹر: پاکستان: تعمیر و تعبیر، لاہور: مکتبہ خیابان ادب، ۱۹۷۷ء، ص۲۶